تحریر: سیّد حسین نصر
ترجمہ: نذیر الدین مینائی

مغربی ثقافت کی جڑیں

تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے، مصر اور لیبیا کی صحرائی سرحدوں پر دو بڑی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھیں۔ برطانوی فوج جنرل منٹگمری کی کمان میں اور جرمن فوج جنرل رومیل کی سپہ سالاری میں۔ منٹگمری جانتا تھا کہ بہت جلد ایک بھیانک فیصلہ کن جنگ شروع ہونے کو تھی۔ اسی کی تیاری کرتے ہوئے وہ اپنے کارواں میں بیٹھا اپنے حریف کی تصویر پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ رومیل کی زندگی، اس کی رایوں اور روّیوں کے بارے میں جو کچھ وہ پڑھ سکتا تھا پڑھ رہا تھا، تصویر کو دیکھ کر اس نے اس چہرے کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی، نیز یہ بھی سمجھنے کی کوشش کی کہ اس چہرے کے پیچھے کس قسم کا دماغ ہے اور اس دماغ میں کیا کیا خیالات ہوں گے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام تنازعات کے ایک بنیادی اصول پر عمل کر رہا تھا اور وہ اصول تھا: "اپنے دشمن کو جانو۔" اسے جانو، اس کا مطالعہ کرو اور اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔

معاصر مغرب کو اسلام اور اُمتِ مسلمہ کا دشمن قرار دینا ذرا زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا آئیے! دشمن نہ کہہ کر اسے ہم چشم، مدّمقابل یا حریف کہیں، لیکن اس کے لیے ہم کوئی بھی لفظ استعمال کریں، واقعہ یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی سیکولر دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان جو اب بھی مذہبی ہے اور جسے "دارالاسلام" کہتے ہیں، ایک ٹکراؤ یا تصادم ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گو دو صدیوں پر محیط دورِ استعماریت میں یہ ٹکراؤ خفی رہا، یہ تاریخ کی ایک ناگزیر حقیقت رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اگر بدھ مت کو ایک مخصوص معاملے کی حیثیت سے ایک طرف کر دیں تو صرف دو مذاہب ایسے ہیں جنھوں نے ساری دنیا پر محیط ایک آفاقی مشن کا دعویٰ کیا اور اس اُمید کو سینے سے لگائے اس کی آبیاری کرتے رہے کہ ایک نہ ایک دن تمام بنی نوع انسان اس ایک سچے دین مسیحیت اور اسلام کی خداداد چھتر چھایا میں آ جائیں گے۔ صرف ایک تبدیلی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ آج اسلام کا ٹکراؤ مغربی مسیحی دنیا سے نہیں، بلکہ مغربی سیکولرازم سے ہے، دہریت سے ہے اور کوری دنیا پرستی سے ہے۔ جہاں مسیحیّت ناکام ہو گئی، وہاں اس کی جگہ جس تہذیب نے لی، اس نے تقریباً مکمل کامیابی حاصل کر لی اور اس سیارے پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا اور اس پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔

پہلے یہ ٹکراؤ ان ایمان والوں کے درمیان تھا جن میں اتنی بہت سی باتیں مشترک تھیں کہ جس کا شاید وہ کبھی اعتراف بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ مماثلت اور اس قادرِ مطلق اور ان دیکھے خدا کی وہ مشترک عبودیت اور پرستش آج موجود نہیں ہے۔ اب یہ خلیج بے حد وسیع ہو گئی ہے اور باہمی تفہیم کہیں زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔ ایک مومن تو بس یہ جانتا ہے کہ اللہ کی ذاتِ مطلق ہے اور اس کی مافوق ادراک حقیقت ایک جبر نفس الامری ہے۔ اس لیے مومن واقعی منکر یا بدعقیدگی کو نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی بے ثمری کا تصور کر سکتا ہے اور منکر خواہ وہ کتنی ہی کوشش کرے اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ اعتقاد اور ایمان کا تجربہ کیا ہے۔ اس کا تخیل دوسری دنیا کے اس عجیب و غیرب مظہر پر حیران رہ جاتا ہے۔

تاہم اگر مسلمانوں کو اس صورتِ حال میں کوئی موثر قدم اُٹھانا ہے اور اس کو بہت صاف صاف اور معروضیت کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا ہے تو اُنہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کیا چیز ہے جس کا وہ مقابلہ کر رہے ہیں یا جس سے اُن کا ٹکراؤ ہے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ مسلمان کو، خواہ وہ مغرب ہی میں کیوں نہ رہتا ہو، اپنے دشمن کی یا اس کو جو خطرہ لاحق ہے، اس کی نوعیت کی ذرّہ برابر سمجھ نہیں۔ برطانیہ میں مقیم مسلمان تارکینِ وطن کی اکثریت اپنے گردوپیش کے لوگوں کو اب بھی عیسائی سمجھتی ہے، اور بہت سے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اُنہیں مسیحیت سے خطرہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ مسیحیت کی کس طرح تعریف کرتے ہیں، زیادہ تر برطانوی لوگ جن سے کسی سرکاری فارم میں اپنا مذہب بتانے کو کہا جاتا ہے تو وہ اس خانے میں "چرچ آف انگلینڈ" لکھیں گے یا "کیتھولک" لکھیں گے۔ اپنی اس طویل عمر میں میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد سے ملا ہوں اور اُنہیں جانا ہے، لیکن میں نے تو آج تک اور اب جب کہ میں عیسائیوں کو اسلام سے متعلق لکچر دے رہا ہوں، کوئی عقیدت مند، ایمان والا اور یقینِ کامل رکھنے والا عیسائی نہیں دیکھا۔ مسلمانوں کو اپنے حریف مذہب سے اب کوئی خطرہ یا خوف نہیں ہے۔ اُنہیں ڈر ہے تو دنیا کے اس حلقے سے جو ایمان کا بیش بہا عطیہ کھو چکا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے کہاں تلاش کرے۔ عملاً یہ خطرہ اس خوف سے کہیں زیادہ خطرناک ہے جو ماضی میں عیسائیت سے تھا، اور یہ خوف انتہائی عیارانہ، پُرفریب اور غیر محسوس ہے، کیونکہ یہ ہمارے دلوں کے اندر بیٹھے ہوئے باغی کو بہت پسند آتا ہے، یہ سرگوشی کرنے والا ہے اور چپکے سے کان میں پھونکتا ہے: "تم کیسے یقین کر سکتے ہو؟"، "تم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ کوئی چیز اس دنیائے حواس کے پرے بھی ہے؟"، "تم کسی ایسی چیز میں کیسے یقین کر سکتے ہو جو نادیدہ، ناشنیدہ اور غیر محسوس ہو؟"

بے عقیدہ لوگوں کی دنیاوی کامیابی کے سبب یہ خطرہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ تیسری دنیا کے اور لوگوں کی طرح مغرب کی طرف مسلمانوں کا رویّہ بھی کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ اسے بہ یک وقت پسند بھی

کرتے ہیں اور ناپسند بھی۔ ایک طرف وہ تلخی، آزردگی اور خفگی بھی ہے جو نوآبادیت کی تاریخ نے ان میں پیدا کی تھی اور اب مغربی حاکمیت اور غلبے نے۔ دوسری طرف پسندیدگی اور رشک کے احساسات بھی ہیں۔ انسانی فطرت میں یہ ایک خلقی کمزوری ہے کہ وہ کامیاب طاقت سے مرعوب ہونے پر تیار رہتی ہے۔ اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغرب ایک غالب طاقت ہے اور یہ طاقت جزواً صنعتی طاقت اور ٹکنالوجی میں مہارت سے حاصل ہوتی ہے، لیکن سب سے زیادہ جس چیز کی پذیرائی ہوتی ہے وہ مغربی حسنِ کارکردگی ہے جس کی بناء پر کام جلد اور خوش اسلوبی سے ہو جاتا ہے۔

تاہم ان تنظیمی ہنرمندیوں کی تعریف و توصیف کے ساتھ ذرا خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ کوئی نسل، کوئی قوم، کوئی انسانی گروہ ہر کام میں طاق نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں ہماری زندگی کی یہی خاصیت ہے۔ اس لیے ہمیشہ سوال ترجیح اور تقدیم و تاخیر کا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس زندگی کے صرف چند پہلوؤں میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو پھر انتخاب کرنا پڑے گا کہ کون سے پہلو زیادہ اہم ہیں۔ جو لوگ ایک میدان میں ہنرمند ہوتے ہیں، وہ دوسرے میدان میں ناقص اور کمزور ہوں گے۔ اس لیے کہ ہم محدود صلاحیتوں والی مخلوق ہیں۔ اگر ہم اپنی شخصیت یا فطرت کے کسی ایک پہلو کو پوری حد تک ترقی دیتے ہیں تو یہ عموماً اپنی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کی قیمت پر کرتے ہیں۔ اگر آپ مغربی انسان کی طرح خدا سے منہ موڑنے پر تیار ہیں، اگر آپ تمام ملحوظات سے قطع نظر کر کے اپنی ساری قوتیں اور جملہ صلاحیتیں اس دنیا کے معاملات پر اور اُنہیں کامیابی سے عمل میں لانے پر صرف کرنے کو تیار ہیں تو آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ آپ اپنی زندگی کے ہر بیدار لمحے میں پیسہ بنانے کی اور زیادہ پیسہ بنانے کی تدبیریں سوچتے رہیے، آپ بالآخر کروڑپتی ہو جائیں گے۔ اس لیے سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس کی قیمت اپنی روح کو مفلس اور بے مایہ کر کے ادا کرنے کو تیار ہیں؟ اور کیا آپ حیوانوں سے بھی نچلی سطح تک گرنے کو تیار ہیں جن کی بھوک اور خواہش محض اس شے تک محدود رہتی ہے جو اُن کے پیٹ بھر دے؟

دو سیدھی سادی مثالیں دیتا ہوں: مسلمانوں کی حیثیت سے ہماری روزانہ کی نمازیں ہمارے روزمرّہ کے کام میں خلل ڈالتی ہیں۔ مغرب میں ایک کامیاب کاروباری یا سرکاری ملازم کام کے دن کے دوران اپنی توجہ کو نماز یا اس قسم کی اور باتوں کی طرف مبذول کرنا گوارا نہیں کر سکتا، وہ "نقصان اُٹھائے گا۔" اب آپ فیصلہ کر لیجیے۔ ہماری زندگی میں قدم قدم پر انتخاب کا مرحلہ درپیش رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغرب میں پیشہ ورانہ زندگی اور نجی زندگی یا ذاتی تعلقات میں مکمل علیحدگی ہے۔ کاروبار کرنے کا مسلمانوں کا روایتی طریقہ — نرمی سے سلام و دعا کرنا، خیر خیریت پوچھنا، چائے یا کافی پیش کرنا — مغربی نقطۂ نظر سے تضییعِ اوقات ہے۔ مغرب کے لوگ جب کاروبار کے لیے ملتے ہیں تو اپنی انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور اپنی نظریں گھڑیوں پر رکھتے ہیں۔ اُنہیں یہ کاروبار مختصر

ترین وقت میں ختم کر لینا چاہیے۔ وہ اشخاص کی طرح نہیں ملتے، گو اشخاص کی طرح ملنا اللہ کی نظر میں انتہائی معنی خیز بات ہے، لیکن نہیں، وہ تو محض ایک پیشہ ور کی حیثیت سے ملتے ہیں جو ایک سودا کرنے آئے ہیں۔ وہ اپنے منصبی مکھوٹے لگائے رہتے ہیں۔ سودا ہوتے ہی وہ سچ مچ کی ملاقات کیے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی اس قیمت کا ایک حصّہ ہے جو حسن کارکردگی کے لیے ادا کی جاتی ہے۔ کیا ہم کسی چھوٹی سی کامیابی کے لیے اپنی انسانیت کو واقعی ترک کر دینا چاہتے ہیں؟

مجھے یقین ہے کہ اس گفتگو کے دوران مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ کیا آپ کی تجویز یہ ہے کہ دنیائے اسلام مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ "پس ماندہ" رہے؟ میں حقیقت پسند ہوں۔ حقیقتاً ہمیں رہنا ہے تو اسی دنیا میں جیسی وہ ہے، نہ کہ اس دنیا میں جیسی کہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہو۔ لیکن مسلمان پس ماندہ کہلائے جانے سے اس قدر خائف ہیں تو میں اس ضمن میں ایک سوال رکھوں گا۔ کیوں صاحب! اس پس ماندگی میں کیا خرابی ہے جب کہ دوسرے لوگ پیش رسی کی جھونک میں تباہی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں؟ کیا ایک صحت مند ضعیف آدمی، گو پس ماندہ ہے اسی عمر کے دوسرے آدمی کے مقابلے میں جو بیمار اور قریب المرگ ہے، بہتر حالت میں نہیں؟ مرنا تو ہم سب کو ہے، لیکن ہمیں اس انجام کی طرف دوڑنا نہیں چاہیے۔

وہ کلچر جسے طاقتور کلچر کہا جاتا ہے، وہ ہمارے نقطۂ نظر سے دھمکانے اور مداخلت کرنے اور یورش کرنے والا کلچر ہے۔

بہر حال اس طاقتور کلچر کی جڑوں پر گفتگو کرنے سے پہلے میں ایک اور بات کہنا چاہوں گا۔ آپ اس کلچر کو اس کی اصلیّت سے زیادہ نہ سمجھیے۔ نوآبادیت کے مؤرخین نے لکھا ہے کہ گزشتہ صدی کے بیچ کے برسوں میں میگزم گن (جو شروع شروع کی مشین گن تھی) کی ایجاد سے پہلے سلطنت برطانیہ طاقت کی بجائے دھونس اور گیدڑ بھبکی پر قائم تھی۔ اس سفید فام آدمی نے محض ایک ڈنڈے کے بل پر دیسی باشندوں کے انبوہ کو دور رکھا۔ اس کی وجہ شاید اس سفید فام شخص کی انتہائی نسلی خود اعتمادی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دیسی لوگ اس پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے اور اُنہوں نے حملہ نہیں کیا۔ خود اعتمادی اصل چیز ہے، کلید ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کی بے مثال اور بے نظیر کامرانیوں کی کلید ہی خود اعتمادی تھی۔ قوت پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔ انگریزوں کو دیکھیے کہ ایک غیر اہم اور چھوٹے سے ساحلی جزیرے کے باشندے تھے، لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے آدھی دنیا فتح کر لی اور اس پر اپنا تسلّط جما لیا۔ یہ لوگ کوئی دیو نہیں تھے جنھوں نے بونوں کو زیر کر لیا تھا، بلکہ بونے تھے جنھوں نے بڑے قوی ہیکل دیووں کو اطاعت پر مجبور کر دیا تھا۔

میں ایک معاملے کی مثال دیتا ہوں۔ انگلستان کے اخبارات حال ہی میں ایک یہودی کاروباری

میکسویل کی پُراسرار حالات میں موت کی خبروں اور کہانیوں سے بھرے پڑے تھے۔ بغیر ضمانت دیے اس شخص نے بینکوں سے دس کروڑ پونڈ سے زیادہ رقم قرض لے لی تھی۔ اس نے یہ کیسے کیا؟ محض دھونس میں اور اپنی بے پناہ خود اعتمادی کی بدولت۔ بڑے بڑے چالاک اور سخت گیر بنک کاروں کو اس کی بات پر شک نہ ہوا، کیوں کہ بذاتِ خود وہ شخص خود اشتباہی سے قطعاً مبرا تھا۔ اسے اپنے پر کوئی شبہ نہ تھا۔

مسلمانوں میں خود اعتمادی کے فقدان کا کچھ سبب تو ان کا نوآبادیت کا تجربہ تھا جو آج بھی قائم ہے جس کی خاص وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ مغرب نے مسلمانوں کو دھونسا کر نوآبادیت کو خود اس کی اپنی قائم کی ہوئی قدر و قیمت پر قبول کروالیا اور اس کی کمزوریوں کو چھپانے میں کامیاب رہا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کی مثال ۱۹۷۰ء کی دہائی کے ابتدائی زمانے میں نام نہاد "تیل کے بحران" کے دوران سامنے آئی ہے۔ تیل پیدا کرنے والوں، خصوصاً سعودیوں نے مغربی دنیا کو ایک طرح سے اپنے پنجۂ غضب میں لے رکھا تھا۔ یہ ان کی بہت بڑی طاقت تھی جو خود ان کے اپنے اور اُمت کے فائدے کے لیے استعمال کی جا سکتی تھی، ان میں جو کمی تھی وہ خود اعتمادی کا فقدان تھا۔ اگر وہ ہوتی تو اپنی اس طاقت کو دانش مندی سے اور مؤثر طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ ان میں جراءت اور جیالے پن کی بھی کمی تھی جو طاقتوروں کو حوصلہ دیتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کا پورے طور پر استعمال کریں۔ موقع ہاتھ سے نکل گیا — اب شاید دوبارہ نہ آسکے۔

جب میں اپنے مسلمان بھائیوں سے مغربی تسلط کی نوعیت اور ماہیت کی بات کرتا ہوں تو میرا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ میں اُنہیں یہ سمجھنے پر راغب کروں کہ یہ طاقت بہت ہی متزلزل بنیادوں پر قائم ہے۔ اب جو ہے سو ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ سمجھنا انتہائی اہم ہے کہ دراصل وہ کیا ہے جس سے ان کا ٹکراؤ ہے، وہ کیا چیز ہے جس سے ہمیں خوف یا خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے گفتگو کے اس سلسلے کا آغاز مغربی کلچر کی جڑوں پر بحث سے کیا ہے۔ یہ جڑیں بہت اُلجھی ہوئی اور بے حد پیچیدہ ہیں۔ یہی شاید وہ پہلی بات ہے جو مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے۔ مسلم ثقافت و تہذیب کی اصل و ابتداء بالکل صاف اور سادہ ہے۔ ان کا صرف ایک ہی ماخذ ہے اور وہ ہے وحی اور سنت رسول ﷺ، اور اس لیے ان کی آسانی سے شناخت ہو جاتی ہے۔ مغربی تہذیب کی جڑیں مختلف ملکوں، مختلف کلچروں اور تاریخ کے مختلف عہدوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

ہمیں اس کی جستجو کی شروعات لامحالہ قدیم یونان سے کرنی پڑے گی۔ ہم لوگوں کو یعنی ہم کہ جو مغرب کی پیداوار ہیں — اسکول میں کوئی ایک ایسی چیز پڑھائی گئی تھی جسے "یونانی معجزہ" کہا جاتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ معجزہ ایک ایسی قوم کا اُبھرنا تھا، جس نے روئے زمین کی دوسری قوموں کے برعکس "توہم پرستی" ترک کر دی تھی اور انسانی عقل کی برتری کو دریافت کر لیا تھا اور اس قوم کے لوگ عقلی

تحقیق اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں میں لگ گئے تھے جس نے مافوق الفطرت باتوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی اور جس نے اپنی بنیاد کے لیے اس دنیا کو لیا جیسی کہ وہ انسانی حواسوں کو نظر آتی ہے نہ کہ اس دنیا کو جیسی کہ وہ اپنی الوہی ابتداء کے حوالے سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں اہلِ یونان —— جیسا کہ ہمیں بتایا گیا —— اپنے زمانے کی اور سب قوموں کے مقابلے میں "ترقی یافتہ" تھے اور اس تاریک عہد میں مشعلِ راہ تھے۔

یہاں میں اصل موضوع سے ذرا سا انحراف کروں گا۔ میرے نزدیک زیرِ غور موضوع سے اس کا گہرا اور اہم تعلق ہے۔ بحیثیت مسلمان کے ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں نبی یا پیغمبر نہ بھیجے گئے ہوں جنھوں نے ان تک حق اور سچائی کو پہنچایا۔ اس لیے کوئی قوم اصلاً بغیر ایسے مذہب کے نہیں رہی جس میں سچائی منعکس نہ ہو۔ اور یہ سچائی ایسے پیرائے میں پہنچائی گئی کہ جس کو وہ سمجھ سکتے تھے اور ان کے ذہن کی رسائی اس تک ہو سکتی تھی۔ یونانی کلچر کی اصل و ابتداء نظروں سے اوجھل ہے، لیکن میرے خیال میں اتنی بات تو صاف ہے کہ اُس وقت تک جب تک کہ یونان نے تاریخِ انسانی میں ایک اہم عامل کی حیثیت اختیار کی، یونانی مذہب روبہ انحطاط ہو کر بُت پرستی میں بدل گیا تھا۔ بہر کیف یہی وہ شکل ہے جو مذہبی انحطاط عموماً اختیار کر لیا کرتا ہے یا کم از کم ماضی میں ایسا ہی ہوا اور یقیناً یہی وجہ ہے کہ اسلام، آخری الہامی مذہب کی حیثیت سے، بُت پرستی کی ہر شکل اور ہر شائبے کا شدید ترین مخالف ہے۔ بُت پرستی کی ایک خصوصیت جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ معقول لوگوں کا اس پر یقین کر لینا مشکل ہے، مثلاً کلاسیکی یونان میں بہت سے مہمل "دیوتا" تھے جو آپس میں لڑتے رہتے تھے، اس لیے مذہب کے تصور ہی کے خلاف یا اور کسی بھی مافوق الفطرت حقیقت کے خلاف ایک ردعمل ہے۔ اور اس ردعمل کا رُخ عقلیت کی طرف ہے۔ یہی وہ عقلیت ہے جو "معجزائی" یونانی ورثہ ہے جس کی مغرب میں اتنی قدر و منزلت ہوئی۔ مسلمانوں نے اس ورثے کو عہدِ عباسی کے ابتدائی زمانے میں دریافت کیا، لیکن اسلام چونکہ ایک مربوط مذہب اور کلچر ہے اور اس کی بنیاد الہامی ہے، اس لیے اس نے یونانی روایت سے صرف وہ لے لیا جو مفید تھا اور جسے وہ بغیر خود کو نقصان پہنچائے ہضم کر سکا اور باقی کو رد کر دیا۔ اسلام نے خصوصاً اس فلسفیانہ بنیاد کو ہی مسترد کر دیا جس پر نام نہاد یونانی دانش مندی قائم اور مبنی تھی، لیکن مسلمانوں نے یونانی ورثے کا زہر آلود پیالہ عیسائیوں کو دے دیا جن کے لیے یہ انتہائی تباہ کن ثابت ہوا۔

یونان کے بعد روم آتا ہے جو شاہی روم کی مہمل اور وحشیانہ تہذیب کا نمونہ تھا۔ یہاں بھی جب تک کہ قدیم روم دنیا میں ایک حقیقی قوت کی حیثیت سے اُبھرے، رومی مذہب نے بھی جو تاریخ کی دسترس سے باہر قدیم ترین زمانے میں جو کچھ اور جیسا بھی رہا ہو، وہی روش اختیار کی جو یونانی مذہب نے کی تھی، یعنی اس میں مکمل طور پر انحطاط آ گیا تھا اور اگر کسی قوم کے مذہب میں ہی انحطاط آ گیا ہو تو

خود اس قوم میں بھی لامحالہ انحطاط ہوگا۔ اس لیے یہ روم کا بیمار چہرہ ہے جو باقی رہا ہے اور اس کا مغرب پر غالب اثر رہا اور اس قدر غالب کہ مثلاً ایک اسکولی بچے کی حیثیت سے مجھے لاطینی زبان سیکھنے پر مجبور ہونا پڑا، کیونکہ وہ ایک ایسی عظیم تہذیب کی زبان تھی جس کے نمونے پر اپنی شہنشاہی شان و شوکت کے دنوں میں ہم نے خود کو ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ اُنہیں رومن لوگوں نے ہمیں ایک ایسی اصطلاح ترکے میں دی جس کا استعمال آج عام ہے اور وہ ہے "بار بے ری ان" یعنی وحشی۔ برطانوی پریس مسلم طرزِ زندگی کو مسلسل وحشیانہ کہتا رہا ہے اور مسلمان اس سے ہمیشہ پریشان ہوجاتے ہیں۔ اس سے ہمیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ قدیم رومی لوگوں نے جن لوگوں کی نسبت یہ لفظ استعمال کیا تھا، وہ ہر اس خوبی میں جو واقعی کسی بھی اہمیت کی حامل ہے، اہلِ روم سے برتر تھے، خوبیوں میں ان سے برتر، طرزِ زندگی میں ان سے برتر تھے اور اس بد اطواری سے مبّرا تھے جو سلطنت روما کا خاصہ تھی اور جس نے بالآخر اسے تباہ کردیا۔

قدیم یونان اور قدیم روم میں معاصر مغربی کلچر کی جڑیں پیوست ہیں۔ پھر اس کے بعد مسیحّیت نے اس بدقماش دنیا میں نفوذ کیا، آہستہ آہستہ قدم جمائے، پہلے تو اس کو بڑی عقوبت پہنچائی گئی، لیکن بالآخر مسیحّیت فتح مند ہوئی۔ کہا جاتا ہے تیل اور پانی ملتے نہیں۔ عیسائیوں نے لاطینی دنیا کو جیسا پایا، اس میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جو ان کے لیے قابلِ قبول ہوتی، اس لیے سلیٹ کو صاف کرنا پڑا، کیونکہ ایک یہودی الاصل مذہب میں اور اس سے پہلے جو کچھ ہوا اس میں کوئی چیز بھی مشترک نہ تھی۔ اور سلیٹ کو واقعی صاف کر دیا گیا۔ عرب جاہلیت میں کچھ ایسے عناصر تھے جنھیں اسلام میں جذب کیا جا سکا۔ حج ایک بدیہی مثال ہے، لیکن رومی جاہلیت میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جسے باقی رہنے دیا جاتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور کے عیسائیوں اور اسی زمانے کے مسلمانوں نے مذہبی عقائد اور اصولوں کے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو بلا کسی دقّت کے سمجھ لیا ہوتا اگر وہ خود کو اس پر آمادہ کر لیتے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اس زمانے کے دار الاسلام کی طرح دنیائے مسیحّیت بھی یکسر مذہبی عقیدے کی روشنی کے سہارے زندہ رہی۔ اس کے باوجود، اس ڈھانچے میں جو خدا پر ایمان کی طاقت کا تابع تھا، ایک خلقی کمزوری تھی، چونکہ مسیحّیت کی ابتداء یہودی فلسطین میں ہوئی تھی، اس لیے اسے ایک طرح سے خارجی مادّہ تصوّر کیا گیا جسے مغربی یورپ میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اور یہ بات خصوصاً یورپ کے شمالی علاقوں کی شامنی روایات کے تعلق سے سمجھی جاتی ہے، یہ قطعاً مخالف تھی ہر اس بات کی جو دنیا کے اس حصّے میں سوچی گئی ہو یا اس میں یقین کیا گیا ہو، یعنی ماضی سے بالکل قطع تعلق کر لیا گیا۔ دوسری طرف دور جاہلیت کے عرب ایک طرح سے اسلام کی آمد کے لیے تیار تھے۔ اسلام ان کے ماضی کو رد کرنے کے لیے نہیں، بلکہ ان کے ماضی میں جو کچھ بہترین تھا

اس کی تکمیل کے لیے طلوع ہوا۔

یہ خلقی کمزوری — جسے "درز" یا شگاف" کہا گیا ہے — پوری طرح نمایاں ہو گئی، جب ہم مسلمانوں نے عالم مسیحیت کو یونانی ورثے کا زہر آلود پیالہ سپرد کر دیا تو اس کے نتیجے میں وہ دور آیا جسے نشأۃ الثانیہ یا نیا جنم کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کے بارے میں ہر یورپی بچے سے کہا جاتا تھا کہ وہ مانے کہ یہ تاریخ انسانی کے انتہائی شان دار اور بار آور واقعوں میں سے ہے۔ وہ کون سی چیز تھی جس نے "دوبارہ جنم" لیا؟ وہ قدیم تاریک خیالی جسے آج ہیومن ازم یعنی مسلکِ انسانیت کہا جاتا ہے؟ جس میں انسان کو خدا سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے، یعنی انسان کا ایک چھوٹا خدا ہونے کا تصور — اور یہ چھوٹا خدا ناگزیر طور پر بالآخر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اسے بڑے اور برتر خدا کی ضرورت نہیں ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے ابتدائی دور کے حضرت عیسیٰ کے مقلد ہونے کے مسیحی نصب العین کے درمیان کافی فرق ہے، اور یہ فرق مائیکل اینجیلو کی دیو پیکر تصویروں اور سنگ تراشی کے نمونوں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ امر کہ یہ چیزیں روم کے سسٹین کلیسا میں دیکھی جا سکتی ہیں، اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ مسلک انسانی کا یہ نصب العین کتنے مؤثر طور پر مسیحی کلیسا یعنی اس زمانے کے کیتھولک کلیسا میں نفوذ کر گیا تھا۔

نشأۃ الثانیہ کے نصب العین پر اکثر پرومیتھی کی صفت منطبق کی جاتی ہے۔ اگر ہم مغربی کلچر کو سمجھنا چاہیں تو پرومیتھیوس کا یونانی اسطور بہت معنی خیز ہے۔ یہ ایک اسطور ہے جو فکرِ اسلامی کے دائرے میں یا مسلم تخیل میں نہ کبھی پیدا ہوتا اور نہ کبھی برداشت کیا جاتا۔ پرومیتھیوس نے دیوتاؤں کے یہاں سے آگ چُرائی یا سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہیے کہ خدا کے یہاں سے یا جنت سے آگ چُرائی۔ گو اس کو اس گناہ کی سزا دی گئی، لیکن اس طرح وہ بنی نوعِ انسان کے لیے بے اندازہ فائدے کی چیز لایا۔ اس افسانے کے سنگین مضمرات پر ذرا غور کیجیے۔ آگ کا عظیم عطیہ انسانیت کو قادرِ مطلق نے نہیں عطا کیا۔ یہ عطیہ خدائے برتر سے جبراً لینا پڑا جو یکسر نافرمانی ہے۔ یہ عالمِ بالا کے خلاف بغاوت ہے جس نے وہ چیز دینا پسند نہیں کی جسے دینا تھا۔ پرومیتھیوس کا یہ افسانہ نشأۃ الثانیہ کے ذہن پر حاوی تھا اور ایک طرح سے آج مغربی کلچر پر اس کا تسلط ہے، یعنی خدا دیتا نہیں، انسان لے لیتا ہے۔

ایک تو خدا کو خارج کر دیا اور پھر اس خیال کو بھی خارج کر دیا کہ یہ دنیا پوری طرح اس ہستی کے ماتحت اور تابع ہے جو اس سے بے حد ماوراء ہے۔ اس کیفیت نے وقت کے ساتھ ایک بالکل سیکولر فلسفے کو جنم دیا، اور ان "جدید" فلسفیوں میں پہلا فلسفی ڈے کارٹے (پیدائش ۱۵۹۶ء) تھا۔ کوئی بھی شخص جسے مذہب سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے یا الہام کے امکانات پر ذرا بھی یقین ہے تو اسے عہدِ وسطیٰ کے علمائے دین اور مذہبی فلسفیوں اور اس نئے فلسفے کے درمیان حیرت انگیز فرق نظر آئے گا۔ اس کا موازنہ اس فرق سے کیا جا سکتا ہے جو ایک عقلمند آدمی اور چالاک بچے میں ہوتا ہے۔ اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے زیادہ مہمل بات کیا ہو سکتی ہے کہ ایک غیر روشن خیال انسانی دماغ سے

تمام عقل و دانشمندی اور ارض و سما کی ساری سمجھ کو نکال پھینکا جائے؟ لیکن ڈے کارٹے نے اپنے اس قول کے ذریعے کہ "میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں" یہی تجویز کیا ہے۔ اس نے اس کو واحد صداقت کی حیثیت سے پیش کیا جسے یقین کے ساتھ جانا جا سکتا تھا۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر دوسرے تیقنات مرتب اور قائم کیے جا سکتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کسی نے کہا تھا کہ ڈے کارٹے کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ "مجھے سوچا جاتا ہے اس لیے میں ہوں۔" دوسرے لفظوں میں چونکہ خدا مجھے "سوچتا" ہے، اس لیے میرا وجود ہے۔

ڈے کارٹے سے ہی مغربی کلچر کو اور سب سے زیادہ سائنس کو دنیا کے بارے میں نظریۂ ثنویت ورثے میں ملا جو کلیتاً اسلام کے برعکس ہے۔ اس سے غیر مادّی اور مادّی میں اور دیدہ اور نادیدہ میں مکمل علیحدگی ظاہر ہوتی ہے — میں اسے روحانی نہیں کہوں گا، اس لیے کہ ڈے کارٹے جس کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا وہ یکسر ذہنی و عقلی تھا — اسی کارٹیئی ثنویت کی بنیاد پر جدید ذہن سرگرمِ عمل ہوتا ہے اور یہی اس طریقۂ استدلال کی فلسفیانہ اساس ہے جسے عام طور پر سائنٹیفک طریقِ استدلال کہا جاتا ہے۔ لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہیں کہ ایسا طریقۂ استدلال جس کی بنیاد ایسے مشتبہ اور مشکوک بیان پر ہو تو کیا اس کے وسیلے سے کسی یقینی صداقت کو دریافت کیا جا سکتا ہے؟

عام لوگوں کی نظر میں اور درسی کتابوں کے لیے ڈے کارٹے پہلا عظیم مغربی فلسفی ہے۔ جن لوگوں نے اس کی پیروی کی، اُنھوں نے اس کے روحانی پہلو کے لیے کچھ گنجائش رکھی ہو یا نہ رکھی ہو اور ان کے خیالات اس سے کئی لحاظ سے مختلف ہوں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خالصتاً سیکولر اور یک رُخے تھے جنھوں نے الہام کے ذریعے علم کے امکانات کو اس ذہنی عمل سے خارج کر دیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے نتائج پر پہنچتے تھے۔

ڈے کارٹے کی موت کے ڈیڑھ سو سال بعد ہم اس دور میں پہنچتے ہیں جو نام نہاد دور "روشن خیالی" کہلاتا ہے۔ واقعتاً یہ ایک عجیب و غریب اصطلاح تھی جسے انسانی ذہن اور انسانی تخیل کی تاریک کاری کے لیے استعمال کیا گیا — اٹھارہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی "فلسفیوں" نے بالآخر اوہام کے سارے بندھن توڑ دیے اور ترک کر دیے، یعنی دنیا کی مذہبی سمجھ اور تقدیرِ انسانی کے تصوّر سے کنارہ کش ہو گئے۔ نشاۃ الثانیہ نے انسان کی تصویر یوں پیش کی ہے کہ وہ خود کفیل ہے، بلکہ یہاں تک کہ وہ فوق البشر ہے۔ دورِ روشن خیالی نے اس تصویر کو اپنی منطقی تکمیل تک پہنچا دیا، اور انسانی ذہن کی برتری کو تمام چیزوں کا پیمانہ قرار دیا۔ انسان کے تصورات اور اس کی قیاس آرائی جو الہام سے بالکل علیحدہ تھے، صداقت اور سچائی کو متعین کرنے والے اور اس کا فیصلہ کرنے والے بن گئے۔ مغربی ذہن پر آج بھی اسی "روشن خیالی" کا تسلط ہے۔

ان سب باتوں کا ایک اور بھی پہلو ہے جس پر نظر نہیں جاتی، اس لیے توجہ سے محروم رہتا ہے،

اور وہ ہے نظریہ اور عمل کا افتراق۔ عیسائی فلسفیوں نے یہ فرض کر لیا کہ علم اور خوبی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے ہی، عقیدے اور عمل کو علیحدہ نہیں کیا جا سکا۔ دورِ روشن خیالی کے فلسفی خالصتاً نظریہ ساز تھے جن کی اپنی ذاتی اخلاقیات اور اپنے ذاتی کردار کا ان کے نظریات سے کوئی علاقہ یا واسطہ نہیں تھا۔ ژاں ژاک روسو جو اس دور کی اہم شخصیّت ہے، اس کی ایک مثال ہے۔ اپنی تحریروں میں اس نے بچوں کے بارے میں ایک نئے خیال، ان کی قدر، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے فرض کی اشاعت کی۔ بچوں کے بارے میں نظریہ سازی میں وہ اس قدر مشغول رہا کہ خود اپنے بچوں کی پروا نہ کی۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے اُنہیں ایک یتیم خانے داخل کر دیا۔

کچھ ہی برسوں میں انقلاب فرانس برپا ہوا جس نے ان "فلسفیوں" کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اسکول کے زمانے میں میں نے اور مغرب کے دوسرے بچوں نے جو سبق پڑھا، وہ یہ تھا کہ یہ انقلاب باوجود اپنے عفریتی مظالم اور اپنی تباہ کاریوں کے ایک ایسی اشرافیہ کے خلاف جائز انقلاب سمجھا گیا جو سماجی ناانصافی کے خلاف کوئی مفید کام انجام نہیں دے رہی تھی۔ یہ ایک جانبدارانہ اندازِ نظر ہے اور اس میں اصل اور لازمی بات سے پہلوتہی کی گئی ہے۔ یہ انقلاب، مذہب کے خلاف بغاوت تھی، ایک نئے خدا یا یوں کہیے ایک نئی دیوی ـــــ "تعقل یا عقل کی دیوی" کے نام پر خدا کے خلاف بغاوت تھی۔

عقل بھی ان اور اوزاروں یا آلۂ کار کی طرح ہے، جن کے ذریعے ہم اشیاء بنا کر اس دنیا میں اپنا گزارہ کرتے ہیں، لیکن "عقلیت" بحیثیت ایک ذہنی رویّے کے ہے، بلکہ میں کہوں گا بحیثیت ایک اذعانی اصول یا ادعا کے ہے جو اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ عقل محض آلۂ کار نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ خود اس کے اندر تمام صداقتوں کو ثابت کرنے کے وسائل موجود ہیں، لیکن اس میں ایک انوکھا مغالطہ ہے، ہم دیے ہوئے امور واقعہ یا آفاقی طور پر تسلیم شدہ مفروضات کی بنیاد پر ہی استدلال کر سکتے ہیں، اگر امور واقعہ کو غلط سمجھا گیا اور یا وہ مفروضات ہی جنہیں ہم نے مان لیا کہ وہ توصحیح ہیں ہی، غلط ہوں تو آپ خواہ کتنی ہی احتیاط اور باریک بینی سے استدلال کریں غلط نتیجے پر پہنچیں گے۔ اس ضمن میں میں وہ مثال پیش کروں گا جو ایک قدیم ہندو عالم شنکر نے دی تھی۔ وہ کہتے ہیں: فرض کیجیے کہ وہ آدمی جو ایک اندھیری جھونپڑی میں بیٹھا ہے، اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور موٹے رسے کے ایک لچھے کو چھو لیتا ہے اور وہ اسے سانپ سمجھ بیٹھتا ہے اور وہ واقعی اسے ایک کنڈلی مارے ہوئے سانپ جیسا لگتا ہے۔ اب یہاں سے وہ شخص پورے طور پر عقل کی بنیاد پر اقدامات کرنا شروع کرتا ہے، وہ اس سے دور بھاگتا ہے یا مدد کے لیے چلاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہاں کوئی سانپ نہیں ہے اور یہ کہ اس شخص کے معقول اقدامات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بالکل اسی طرح اگر کوئی اس مادّی دنیا کو غلطی سے ایک واحد حقیقت سمجھ لے جو مغرب کے جدید انسان کا ایک بے سوچا سمجھا مفروضہ ہے تو آپ اس مقدمے پر

کتنا ہی پختہ استدلال کیوں نہ کریں، حق و صداقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

جہاں تک یورپ کے دانشور رہنماؤں اور خاص کر رائے سازوں کا تعلق تھا "عقلیت" کی مکمل فتح ہو چکی تھی، لیکن خواہ کوئی بھی تہذیب یا کوئی بھی کلچر ہو عوام ہمیشہ سست رو ہوتے ہیں اور دنیا کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو ذرا مشکل ہی سے بدلتے ہیں۔ عام لوگوں کے دل و دماغ پر مذہب کی گرفت کو بالآخر جس چیز نے توڑا وہ سائنس تھی، بلکہ ایک مخصوص مادہ پرستانہ سائنس کا وجود میں آنا اور اس کی ترقی تھی جس نے ساری حقیقت کو ریاضیاتی تصویر اور ایک مشینی نظام میں ڈھال دیا تھا۔

آخری وار بلاشبہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا تھا جو گزشتہ صدی کے بیچ کے برسوں میں رائج ہوا۔ اسے "سائنٹیفک" نظریہ کہنا بالکل غلط ہے۔ یہ پہلے بھی ایک افسانہ تھا اور آج بھی ہے، اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہ تو مشاہدہ کیے ہوئے اُمور پر قائم ہے اور نہ ہی کسی قسم کے تجربے پر۔ یہ بہرحال ایک افسانہ ہے جس نے موجود اُمور کی کچھ اس طرح تشریح کی جس نے اس دنیا سے پرے کی حقیقت کے ہر تصوّر کو نظر انداز کر دیا۔ اس نظریے میں ان ذہنوں کے لیے بڑی اپیل تھی جنھیں پہلے ہی سے کائنات کے تئیں ایک مادہ پرستانہ نظریہ رکھنے پر تیار کیا جا چکا تھا۔ تاریخ کے اس خاص لمحے میں کسی نہ کسی کا اس قسم کے نظریے کی ایجاد کرنا ناگزیر تھا۔ اتفاق سے ڈارون وہ شخص نکلا جس نے ایسا کر دکھایا۔ یہ نظریہ جو ابھی تک سائنٹیفک طور پر غیر ثابت ہے، معاصر ذہن پر حاوی ہے اور اس نے انسانی ترقی کے ایک افسانے کو جو پہلے سے ہی اُبھر رہا تھا، مزید تقویت پہنچائی۔

میں اپنی بات کے لیے ایک چھوٹے سے واقعے کی مثال دوں گا جو کچھ برس پہلے ہوا جب میں ٹرینداد میں برٹش فارن سروس میں تھا۔ ایک سفارتی عشائیہ میں میں مہمان تھا۔ میرے برابر بیٹھی ہوئی ایک جوان خاتون ایک انگریز پادری سے گفتگو کر رہی تھیں۔ میں ان کی گفتگو کچھ کچھ سن رہا تھا کہ میں نے ان خاتون کو کچھ اس طرح کی بات کہتے سُنا کہ وہ انسانی ترقی کی بات کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتیں۔ پادری نے اُنھیں کچھ اس قدر بدتمیزی اور حقارت سے جواب دیا کہ میں اس سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "خاتون بالکل ٹھیک کہتی ہیں! واقعی حقیقی ترقی جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔" پادری صاحب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ غصّے سے ان کے ماتھے اور چہرے پر شکنیں پڑ چکی تھیں۔ اُنھوں نے کہا "اگر میرا بھی یہی خیال ہوتا تو میں اسی رات خودکشی کر لیتا"، چونکہ خودکشی کرنا عیسائیوں میں بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا مسلمانوں میں ہے۔ مجھے یہ جملہ کافی انکشافی لگا۔ مجھے پہلی مرتبہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ ترقی میں یقین نے کس حد تک مذہب میں یقین کی جگہ لے لی ہے۔

میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم ایسے مسلمان ہیں، --- جو ترقی کے اس واہمے یا افسانے کے پورے مضمرات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اگر یہ صحیح ہے، یا کم از کم مغربی کلچر میں جس طرح اسے سمجھا جاتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم لوگ اپنے زمانے میں زیادہ

عقلمند اور بہتر ہیں اگلے وقتوں کے لوگوں سے۔ اور یہ کہ مذہب کے بارے میں ہماری سمجھ بوجھ ان سے برتر ہے۔ اس سے بڑی انقلابی تبدیلیوں یا بدعت کے لیے راہ کھلتی ہے۔ مسیحی کلیساؤں میں بالکل یہی ہوا اور مجھ سے متواتر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر اسلام کا اس طرح ارتقاء کیوں نہیں ہوتا۔ جب ہم بُری طرح پیش آتے ہیں یا بدتمیزی کرتے ہیں، اور جب مسلمان ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور ایک دوسرے پر بدعتی ہونے کا الزام لگاتے ہیں تو یہ ہمارے انحطاط کی نہیں، بلکہ ہماری پس ماندگی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور وہ لوگ جن کے دلوں میں ہمارے لیے کوئی نرم گوشہ ہے، کہتے ہیں: بے شک ہم سمجھتے ہیں، لوگ ابھی اپنے مذہب کی محض پندرہویں صدی میں ہیں۔ آپ لوگوں کا بھی ہماری طرح وقت کے ساتھ ارتقاء ہوگا اور آپ بھی پختہ ہو جائیں گے۔

چونکہ ترقی میں ایمان اس قدر لاکلام ادعائی اصول بن گیا ہے اور چونکہ حیات اور ممات کا عقیدہ کمزور پڑ گیا ہے تو جنّت یا دوزخ کا جو ہمارا تصوّر ہے اس تصوّر کی جگہ ایک مبہم سے یقین نے لے لی ہے کہ بالآخر مستقبل میں جب ہم کو مرے ہوئے عرصہ گزر گیا ہو گا، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسی روئے زمین پر ایک جنّت وجود میں آئے گی، گو ہم بد قسمتی سے اسے نہ دیکھ پائیں گے۔ اس عقیدۂ باطل کی قربان گاہ پر بہت سی زندگیاں قربان کر دی گئیں۔ وہ لوگ جو مذہب کے سخت مخالف ہیں، ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب کی وجہ سے لامتناہی جنگیں ہوئی ہیں، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کوئی یہ شمار کرنے میں آج تک کامیاب ہوا کہ کتنے کروڑ مرد، عورتیں اور بچے اس صدی میں ترقی اور ایک بہتر دنیا کو جنم دینے کے نام پر ذبح کر دیے گئے۔ اس عقیدۂ باطل کی تکمیل مارکسزم - لینن ازم میں ہوئی۔

مارکس کے نظریات، اس کے بظاہر سائنٹیفک نظریات، اس صدی کے اوائل ہی میں تقویمِ پارینہ بن چکے تھے۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ حقیقت بہت بڑی تعداد میں ذہین اور نیک نیت لوگوں کو ان نظریات سے پُرجوش یقین کلّی کے ساتھ وابستگی سے باز نہ رکھ سکتی۔ یہ بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کو ایک کلّی اور مکمل سچائی کی ضرورت ہے جس کے لیے وہ اپنے کو پوری طرح وقف کر دے۔ تاہم اس نظریے کو جب عملی جامہ پہنایا جائے گا تو اس نظریے کے مطابق اس شاندار مستقبل کے آگے جب اس روئے زمین پر مارکسی جنّت قائم ہو چکی ہوگی، انسانی تکلیفوں اور صعوبتوں کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ کسی شمار قطار میں نہیں۔ یہ مخلوق انسانی اپنے نجی مفادات، اپنے رسم و رواج اور اپنی سرکشی کے ساتھ اس یوٹوپیائی خواب کے حقیقت بننے کی راہ میں حائل ہو گئی، لیکن اس مخلوق کو انسان نہ سمجھا گیا، بلکہ اُنہیں سڑک کے بیچوں بیچ پڑی رکاوٹ مانا گیا۔ ایسی رکاوٹیں جنہیں دور کرنے کے لیے ان پر بل ڈوزر چلا کر اُنہیں اجتماعی قبروں میں دھکیل دینا چاہیے۔ تمام یوٹوپیائی خوابوں کا یہی حشر ہوتا ہے جب ہم ان سے بہرہ ور ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایسے مسلمان جوانوں سے مل کر بہت ڈر لگتا ہے جو اپنے اسی زمانے میں رسول اللہ کے زمانے کے مدینے کا کامل

اسلامی معاشرہ دوبارہ قائم کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس وقت اور اس کے بعد کے ایک مختصر عرصہ کو چھوڑ کر اس دنیا میں کوئی کامل معاشرہ نہیں ہو سکتا۔

انسان کی بنیادی فطرت کبھی نہیں بدلتی اور کیسے بدلے؟ اس لیے کہ اللہ کی باتیں تو بدل نہیں سکتیں۔ اس کے اندر ایک خالی جگہ ہے جسے صرف خدا پر ایمان و یقین رکھنا ہی پُر کر سکتا ہے۔ جب انسان عبادت اور پرستش کے ایک ماورائی مقصد سے محروم ہو جاتے ہیں کہ جس مقصد کی ضمانت عالم بالا سے براہ راست الہام کے ذریعے دی گئی ہو تو وہ ہمیشہ اس دنیا میں کوئی نہ کوئی شے یا ذات تلاش کر لیتے ہیں جس پر اپنی پرستش کو مرکوز کریں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، ہم نے اس بات کو اس تعصّب، جنون، تشدّد یا کٹر پن میں دیکھا ہے جو ہماری اس صدی کی نازازم سمیت بڑی سیاسی تحریکوں کی خصوصیت رہی ہے۔ ہم نے اسے ہکسلے کی امنگوں اور حوصلوں میں دیکھا ہے۔

ہکسلے اُنیسویں صدی کا ممتاز ترین سائنس دان تھا جو سائنس کی پادریت یا "سائنس کی پرستاری" قائم کرنا چاہتا تھا۔ مغرب میں بہت سے لوگوں کے نزدیک سائنٹیفک صداقت میں یا جو سائنٹیفک صداقت معلوم ہوئی ہو، اس میں یقین رکھنا ایک ایسی خوبی ہے جو ہم عموماً مذہب، عقیدے اور یقین سے وابستہ کرتے ہیں۔

بہر حال اب انسان کے مسائل کے سیاسی حل پر یقین کم ہوتا جا رہا ہے اور اسی طرح جدید سائنس کی ناقابلِ تردید سچائیوں پر سے بھی ایمان اُٹھ رہا ہے، اس لیے آج کل چاروں طرف صحیح معنوں میں مذہبی عقیدے کی بے پناہ چاہت اور رغبت نظر آ رہی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لوگ روایتی مذہب یعنی مسیحیّت کی طرف مراجعت کے لیے تیار ہیں۔ یہ بات میں مغربی دنیا کے حوالے سے کر رہا ہوں۔ شیطان کو اپنے مقصد سے اتنی آسانی سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ لوگ ذاتی آزادی کے اس حد تک عادی ہو گئے ہیں کہ وہ تمام پابندیوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور مسلکِ انسانیت کی رو سے نفس کو رفعت دینے سے یا اسے بڑھانے چڑھانے سے روایتی مذہب اپنی پابندیوں اور نفس کشی کی بناء پر ناپسندیدہ اور نامرغوب ہو جاتا ہے۔ نئے مذہبوں کو ایجاد کرنا زیادہ آسان، کم مقتضی اور زیادہ آسائش بخش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اینگلو سیکسن حصّے میں خصوصاً اس گرسنگی کی تسکین کے لیے نئے نئے مسلک پیدا ہوتے جا رہے ہیں، لیکن اس بھوک کو اصلی تغذیہ سے نہیں، بلکہ نقلی غذا سے مٹایا جاتا ہے۔

یہ مسلک جو اکثر مذہبِ "عہد نو" سے متعلق ہوتے ہیں، ان کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہوتی ہے، وہ سب ماورائیت کے منکر ہیں یا وہ ماورائی حقیقت کے امکانات سے پہلو تہی کرتے ہیں، اس لیے یہ مسلک، مذہب فطرت قسم کی کوئی شکل اختیار کر سکتے ہیں جیسے "زمین کی دیوی" میں عقیدہ رکھنا، یا پھر وہ بدھ مت سے، ہندو ویدانت سے یا تصوّف سے کچھ

عناصر مستعار لے لیں گے۔ ان مستعار عناصر کو یوں کہیے کہ افقی سطح یعنی دنیاوی سطح پر لے آیا جاتا ہے اور پھر اُنہیں ایسے عقیدوں میں شامل کر لیا جاتا ہے جو نفس کو سراہتے ہیں اور اس کی بے لگام حسبِ مرضی جولانی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ شہوانیت کو مذہبی تجربے کا بدل قرار دینے کے لیے اس میں عاشقانہ تصوّف کے عناصر بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ نشأۃ الثانیہ اور روشن خیالی کی غلطیوں سے اپنا دامن پاک نہیں کر سکے۔

آج مغربی انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے، اسے ایک شناخت کی تلاش ہے، خواہ وہ مذہبی شناخت ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ربط و تعلق اور ایک حوالے کی تلاش میں ہے، لیکن روایتی مذہب کے انحطاط نے ایک ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ ایک عام مرد یا عورت مذہب سے حیرت انگیز طور پر ناآشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلک جن میں ایک بے وقوف بچے کے لیے بھی کسی کشش کی آپ توقع نہیں کر سکتے، اُنہیں پختہ کار لوگ جو کسی طرح بھی بے وقوف نہیں، بہ آسانی قبول کر لیتے ہیں۔

جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے سائنس میں یقین واقعی کم نہیں ہوا ہے، گو مزاج و ماہیّت میں کچھ تبدیلی آئی ہے، کیونکہ خود سائنٹیفک تناظر میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہم اسے سائنسیت کہتے ہیں، کیونکہ یہ درحقیقت معاصر ماہرین طبیعیات کے پیچیدہ نظریات اور قیاسات پر مبنی نہیں۔ یہ ماہرین طبیعیات کچھ نہ کچھ گنجائش ناقابلِ ادراک یا ناقابلِ فہم باتوں کے لیے بلکہ الوہی پہلو کے لیے بھی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اس مبہم تصوّر کے ساتھ کہ سائنس ہر چیز کی تشریح و توجیہ کر سکتی ہے اور ہر ممکن سوال کا جواب دے سکتی ہے۔ یہ عہد "عہدِ عرفان" کہلاتا ہے، جبکہ یہ واقعی عہد جہالت یا عہدِ لاعلمی ہے۔ لاعلمی ہر اس چیز کی جو حقیقتاً اہم ہے۔ الہام سے انکار نے اور ذہنی وجدان سے انکار نے (جسے ایک داخلی احساس کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے، اسے اس مستند صداقت کا پر تو نہیں سمجھا جاتا جو خدا کی طرف سے ہمارے دلوں میں اُتاری گئی ہے) جدید مغربی انسانیت کو ناقابلِ تصوّر حد تک غریب اور فرومایہ کر دیا ہے۔

اب کہیں کوئی کوئی یقینی رہنمائی نہیں ملتی۔ مسیحی کلیساؤں نے لوگوں کو مایوس کر دیا ہے، کیونکہ وہ خود ہر جدید فریب و سراب کے سحر میں ہیں اور اُنھوں نے بڑی مستعدی سے اس دور کی تمام غلطیوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ یوں کہیے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک طرف ہو کر ایک متبادل اور بنیادی طور پر مختلف تناظر پیش کرتے، وہ خود انبوہ کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ اُنھوں نے زیادہ تر اس عام خیال کو قبول کر لیا ہے کہ عقیدہ یا ایمان ایک غیر معقول اور خلافِ عقل چیز ہے اور عقلِ سلیم یا معمولی فہم و فراست کے برعکس ہے، اُنھوں نے اپنی ذہنی شخصیّت کھو دی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے پیروؤں کو یہ ماننے پر راغب نہ کر سکے کہ ایک ماورائی حقیقت ہے اور عاقبت کی زندگی ہمارے اس

مختصر وجود سے کہیں "زیادہ بہتر اور دیرپا" ہے۔ اپنی اس کوشش میں مایوس ہو کر وہ بھی علائقِ دنیوی کے بندے ہو گئے اور خالص دنیوی معاملات میں لگ گئے۔

اب مجھے یہ مزید لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ وہ لوگ جو جدیدیت، عقلیت اور سائنسیت کی غلطیوں سے اُکتا گئے ہیں اور جو ان فریبوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں، ان کے لیے ایک گھر، ایک پناہ گاہ ہمیشہ حاضر ہے: اسلام۔ بہرحال ہمیں یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ ہماری امّت کے رہنما اور دانشمند لوگ اس دام میں نہ پھنسیں گے جس میں مسیحیّت پھنس چکی ہے اور اپ ٹوڈیٹ اور ترقی پسند ہونے کے شوق میں ان کے نقشِ قدم پر نہ چلیں گے۔ ہمیں دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہمیں اس گمراہی اور روگردانی سے محفوظ رکھے۔

(بہ شکریہ "جامعہ" - دہلی)